۱۳

ایک فکری دھماکے کی ضرورت

قوموں کی زندگی میں نشیب وفراز کا آنا ایک بات ہے اور تقلیب فکر ونظر کا پیدا ہوجانا بالکل ہی دوسری بات۔ اول الذکر جہاں صورتِ حال کے تسلسل کا اعلامیہ ہے وہیں ثانی الذکر اس بات سے عبارت ہے کہ اب آگے امکانات کی ایک نئی دنیا بس پید اہوا چاہتی ہے۔ حالیہ دنوں میں عرب شاہراہوں پر یا نصرالله یاحبیب اضرب اضرب تل ابیب کی جومخمورکن صدائیں بلند ہوتی رہی ہیں اس سے بظاہر یہی محسوس ہوتا رہا کہ آنے والا آچکا ہے جو اپنے جذبۂ ایمانی اور عزم واستقامت کے بل بوتے پرا پنے سے کہیں بڑی، منظّم اور مسلح قوت پر فتح پانے والا ہے۔ مسلمان جو صدیوں سے اپنے زوال کے سدباب کے لیے بےچین او رمضطرب ہیں وہ امید کا کوئی موقع کھونا نہیں چاہتے۔ لیکن کیا مزاحمت کے اس طریقہ کار میں واقعی اتنے امکانات ہیں کہ اس راستے پر چل کر آنے والے دنوں میں امت مسلمہ کی دوبارہ تنصیب امامت ممکن ہوسکے؟

یہ خیال کہ اگر ساری دنیا کے مسلمان اسرائیل پر ایک بالٹی پانی ہی ڈال دیں تو ریاست اسرائیل دنیا کے نقشے سے بہہ جائے گی، ایک شاعرانہ استعارہ تو ہوسکتا ہے جو یہ بتانے سے قاصر ہے کہ آخر ساری دنیا کے مسلمانوں کو ریاست اسرائیل پر محض ایک بالٹی پانی ڈالنے کی توفیق کیوں نہیں ہوتی؟ جن لوگوں کی زندگیاں عالمی استعمار کے ہاتھوں جہنم بن گئی ہوں جو حالات کے دبا ؤ سے تنگ آکر فکری انارکی کی راہ پر چل نکلنے حتیٰ کہ خودکش دھماکوں کا راستہ اختیار کرنے پر بھی خود کو مجبور پاتے ہوں، آخر کیا بات

ہے کہ وہ اس بے ضرر شاعرانہ نسخہ پر عمل نہیں کرتے؟ جس چیز نے امت کے بہترین دماغوں کو صورتِ حال کے حقیقی ادراک سے روکے رکھا ہے اس میں ان اصطلاحوں کا بھی اہم رول ہے جن کی جڑیں حقیقی زندگی کے بجائے عالم خیال میں پائی جاتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان اصطلاحات اور الفاظ سے اپنا دامن بچائیں جو حالات کی سنگینی پر پردہ ڈالنے کے لیے وضع کی گئی ہیں۔

مسلم علماء ودانشوروں پر ہی کیا موقوف دیکھا جائے تو پوری امت مسلمہ، ان کے درجنوں ممالک اور ان کے حکمراں صدیوں سے ایک عالمِ خیال میں جی رہے ہیں۔ وہاں جو کچھ نظر آتا ہے وہ دراصل ہوتا نہیں۔ مثلاً بظاہر تو یہ محسوس ہوگا کہ عالم اسلام ایک بھرپور زندگی کی چہل پہل سے معمور ہے۔ حکمرانوں کے ایوان قوت وسطوت کے امین ہیں اور محراب ومساجد میں روحانی زندگی کا کاروبار شوق وشغف سے جاری ہے۔ لیکن اگر آپ کی نگاہیں ظاہری سطح سے نیچے دیکھ سکیں تو یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ سب کچھ ایک فرسودہ طلسم کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہم مدتوں سے اس طرز زندگی کے اتنے خوگر ہوگئے ہیں کہ ڈرامے کے یہ تمام کردار اب ہمیں اصل دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے علماء ومفکرین ہوں یا حکمراں یہ سب کے سب تمثیلی کرداروں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایکٹ کے خاتمے پر فجر جدید کی آمد کا جو مژدہ سنایا جاتا ہے وہ پردہ گرتے ہی اپنے تمثیلی کرداروں کے ساتھ فضا میں تحلیل ہوجاتا ہے اور ہماری عملی زندگی کا عذاب جوں کا توں جاری رہتا ہے۔

سچ پوچھیے تو من حیث الامۃ ہم ایک fake world یعنی تمثیلی دنیا میں رہنے پر مجبور ہیں۔ مجھے گاہے بگاہے ایسے محلات میں جانے کا موقع ملتا رہا ہے جن کے درودیوار قیمتی دھاتوں سے مرصع کئے گئے تھے جن پر اعلیٰ درجے کی مینا کاری کے سبب نگاہیں ٹھہرتی نہ تھیں، ایک ایک محل کی قیمت اربوں ڈالروں میں بتائی جاتی ہے اور خود ان کے انتظامات پر جتنی بڑی رقم صرف ہوتی ہے اس بجٹ میں عالمی سطح کی کئی یونیورسٹیاں چلائی جاسکتی ہیں۔ میں نے ان حکمرانوں کے ابرواشارے کے مظاہر بھی دیکھے ہیں کہ کس طرح ان کی ایک جنبش نظر پر کارندے دوڑے پڑتے ہیں، اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص کے اشارے میں اتنی قوت ہے جو ایک دنیا کی تقلیب کے لیے کافی ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بیچارے اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ نہ یہاں کوئی بادشاہ ہے نہ کوئی فوج، اور نہ ہی کوئی خودمختار ملک ہے جس کا اقتدار اعلیٰ کسی آزاد قیادت کے ہاتھوں میں ہو۔ کچھ یہی حال مذہبی زندگی کا بھی ہے جو بظاہر مادی آلائشات سے دور طربوش بردار علماء اور ظاہر پرست مشائخ کی چلت پھرت سے قائم ودائم دکھائی دیتی ہے۔ یہاں بھی کوئی فقیہ ہے تو کوئی مفتی اعظم، کوئی شیخ الاسلام کے منصب پر فائز ہے تو کسی کو امیر الامت ہونے کی غلط فہمی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس تمثیلی طریقۂ حیات پر اب ہمیں حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ ڈرامے کا بادشاہ اگر الفاظ کی سطوت میں کھوجائے تو بلند آہنگ مکالمے اسے ایک لمحے کے لیے ہی سہی اس غلط فہمی تو میں مبتلا کرہی سکتے ہیں کہ وہ کوئی اور نہیں ایک مطلق العنان بادشاہ ہے۔ کاش کہ ان تمثیلی کرداروں کو اپنی اصل حقیقت کا ادراک ہوتا۔

ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مزاحمت خواہ کتنی ہی با حوصلہ کیوں نہ ہو وہ فتح کی متبادل نہیں ہوسکتی۔ مزاحمت کسی اقدامی عمل کا پہلا زینہ ہوسکتا ہے آخری منزل نہیں۔ زوال کی صدیوں میں جہاں امت نے مزاحمت کی حیرت انگیز داستانیں رقم کی ہیں ہم فی نفسہ اس عمل کو اپنی جدوجہد کا منتہا و مقصود سمجھنے لگے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس سے آگے کا مرحلہ ہمارے منشورِ عمل سے خارج ہو۔ لبنان میں حزب اللہ کی حالیہ مزاحمت، جس سے عالم عرب میں امیدوں کے نئے چراغ روشن ہوئے ہیں، ہماری ملی تاریخ کا پہلا واقعہ نہیں ہے۔ استعماری نوآبادیاتی نظام کو الٹ پھینکنے میں مزاحمت ہی ہمارا ہتھیار رہی ہے۔ مزاحمت کے سہارے ہی ہم نے سرخ افواج کو افغانستان چھوڑنے پر مجبور کیا اور یہ مزاحمت ہی کا نتیجہ ہے کہ عراق میں اب تک دنیا کی سب سے بڑی عسکری قوت کے منصوبے شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکے ہیں۔ لیکن ان تمام حوصلہ افزا نتائج کے باوجود ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں تکلف کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے کہ محض مزاحمتی تحریکوں اور مزاحمتی ترکیبوں سے ہماری تنصیب امامت ممکن نہیں۔ افغانستان اور عراق پر امریکی یلغار ہو یا لبنان اور فلسطین پر اسرائیلی جارحیت، ہم اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کرسکتے ہیں کہ ان معرکوں میں دو فریقوں کے مابین طاقت اور نقصانات کے عدم توازن میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک طرف جدید خطرناک اسلحوں سے مسلح تربیت یافتہ فوج ہے تو دوسری طرف نہتے سرفروش مزاحمت کار۔ ایک طرف فضا سے مار کرنے والے اسلحوں کی بہتات ہے تو دوسری طرف اس بات کا انتظار کہ دشمن زمینی جنگ کے لئے سامنے آئے تو دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملے۔ عملاً زمینی جنگ شروع بھی نہیں ہوتی کہ فی الواقع جنگ کے خاتمے کا اعلان ہوجاتا ہے۔ لبنان میں حزب اللہ کی مزاحمتی تحریک اپنی منتہا پر اگر کچھ کرسکی تو بس یہی کہ اس نے اپنے عزائم کو مضمحل ہونے سے بچائے رکھا۔ یہ ایک ایسی فتح تھی جس میں مفتوح افواج کو آخری لمحے تک عسکری غلبہ حاصل رہا یہاں تک کہ جنگ بندی بھی ان کی شرائط کے مطابق انجام پائی۔ عزائم اور حوصلوں کو شکست و ریخت سے بچالینے کا کام فی نفسہ اپنی جگہ اہم ہے لیکن اسے فتح پر محمول کرنا ہمارے مستقبل کے سلسلے میں تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

اس سوال پر کمالِ سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ صدیوں سے مزاحمتی تحریکوں میں جان دینے والے سرفروشوں کو اس بات کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ غاصب قوموں کا ٹیکنالوجی کی مروجہ سطح پر مقابلہ کرسکیں۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ زبردست افرادی اور مادی وسائل کی فراوانی اور راہِ خدا میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کی شدید خواہش کے باوجود مزاحمت کاروں کے حصے میں از کار رفتہ زلزال میزائیلیں آئی ہیں۔ F-16 یا اپاچی ہیلی کاپڑوں تک ان کی رسائی کیوں نہیں ہوسکی ہے؟ وہ دانش گاہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کو اپنا ہدف قرار دیتی ہیں اور جہاں شب و روز ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا درس دیا جاتا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ ان دانش گاہوں میں نہ تو دفاعی تحقیق کا کوئی شعبہ ہے اور نہ ہی کوئی ایسی فکرمندی کہ

F-16 اور B-52 بمبار طیاروں کا ٹیکنالوجی کا سطح پر کیسے مقابلہ کیا جائے۔ گویا آگے کا راستہ صرف مزاحمتی نفسیات سے طے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ پچھلی کئی صدیوں میں امت کا مزاج مزاحمتی تحریکوں اور مزاحمتی تحریروں کے ذریعے تشکیل پایا ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے علمی ادارے بھی اسی خیال سے قائم کئے گئے ہیں کہ وہ اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا مکمل اور شافی جواب دے سکیں۔ ایسی صورتِ حال میں آگے کا راستہ بنانے کے لیے ایک نئے دل و دماغ کی تشکیل اولین اور ناگزیر مرحلہ ہوگا۔

ایک فکری دھماکے کی ضرورت

اقوامِ عالم کی سیادت کے دعویداروں کے لیے لازم ہے کہ وہ مدافعت اور مزاحمت کے بجائے توسع اور درگزر سے کام لیں۔ مدعو قوموں کا اپنا حریف سمجھنے کے بجائے اپنا امکانی حلیف سمجھیں اور اپنے تاریخی سفر کا کمالِ احتیاط کے ساتھ کچھ اس طرح جائزہ لیں کہ انہیں تیرہ صدیوں پر مشتمل تاریخی سفر میں در آنے والے فکری التباسات کا بآسانی ادراک ہو سکے۔ ہم پچھلی تیرہ صدیوں میں اپنے مسلسل گرتے گراف کے باوجود اسی روایتی انداز سے چلنے کے عادی رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی صدیوں میں وضاعین و کذابین کے ہاتھوں اور اقوامِ غیر کے تہذیبی اور فکری سرمایوں کے زیر اثر ہماری فکر میں جو التباسات در آئے اور جسے ایک مصنف سے دوسرے مصنف تک نقل در نقل کے ذریعے اعتبار ملتا رہا، اس کے تحلیل و تجزیہ کا واقعی کام انجام نہ پا سکا۔ اس خیال کے ثبوت کے لیے خود روایتی فکر میں اتنا سرمایہ موجود ہے جس سے فاعتبروا یا اولی الالباب کا کام لیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر فہم قرآن میں اسرائیلیات یا عوامی قصوں کا عمل دخل، شانِ نزول کی متضاد تاریخی روایتیں اور روایتوں کی ترتیب و تشکیل میں وضاعین اور کذابین کی کارگزاریاں، ترک دنیا کے بظاہر ایمان انگیز بیانات پر عیسائی رہبانیت کے سائے، جبر و قدر اور الٰہیات پر یونانی فلسفہ کے اثرات اور منہاج النبوۃ سے ملوکیت تک کے سفر میں دین اسلام کی ملوکیانہ تشکیل و تعبیر -- یہ وہ التباسات ہیں جن کی واقعی تطہیر کا کام ابھی باقی ہے۔ ابتدائی عہد میں رفع فتنے کے خیال سے منحرف ملوکیت کو جس طرح وقتی طور پر انگیز کر لیا گیا تھا آگے چل کر اس کے مداوے کی کوئی ہمہ گیر کوشش بارآور نہ ہو سکی۔ عمر بن عبدالعزیز کی ناکام کوششوں کے بعد اسی منحرف منہج کو مسلسل انگیز کیا جاتا رہا یہاں تک کہ خلافت کا علامتی ڈھانچہ بالآخر عثمانی ترکوں کے ہاتھوں اپنے اتمام کو پہنچا۔ اس طویل عرصے میں جو عمر بن عبدالعزیز کے غیاب سے لے کر سلطان عبدالحمید تک کوئی بارہ صدیوں پر مشتمل ہے اسلام کی تعبیر پر سیاسی نظام کا سایہ مسلسل پڑتا رہا ہے۔ شیخ الاسلام کی سرکاری سرپرستی کے بغیر دین مبین کی جو انفرادی تعبیریں سامنے آئیں وہ یا تو سرکاری دائرہ فکر کا توسیعہ رہیں یا پھر گزرتے وقتوں کے ساتھ marginalise ہو کر رہ گئیں۔ تاریخ کے صفحات میں مختلف ائمہ فقہاء کا ظہور اور پھر ان کا اس طرح غائب ہو جانا کہ آج ان کے پیروکار تو کجا ان کی تصنیفات بھی نہیں ملتیں، دراصل اسی خیال پر دلالت

کرتا ہے کہ نظامِ وقت کی سرپرستی کے بغیر ان جلیل القدر فقہاء کا پردہ خفا میں چلے جانا ان کا مقدر تھا۔ اسی طرح احادیث کے کئی مجموعے جن کے نام تاریخ کے صفحات میں ملتے ہیں بوجوہ ہم تک نہیں پہنچ پائے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ جن فقہاء یا ان کے شاگردوں کو نظامِ وقت کی سرپرستی حاصل رہی یا جن مفکرین کو ان کی زندگی یا موت کے بعد نظامِ وقت سے کوئی گرویدہ مل گیا، ان کا فکری سلسلہ مستقبل کی تاریخ کے لیے محفوظ ہوگیا۔ رہے وہ لوگ جو سرکاری تعبیر کے یکسر منکر تھے وہ یا تو زبان بند کرنے پر مجبور ہوئے یا جب ان کی زبان کھلی تو ان سے پر اسرار اقوال منسوب ہوگئے بلکہ بعض فرقوں نے مصائب کی شدت سے تنگ آ کر اپنے امام کو ہی غائب قرار دے ڈالا۔ بعض پر خوارج کی پھبتیاں کسی گئیں اور عامۃ الناس کو یہ باور کرایا گیا کہ وہ قرآن مجید کی پرسوز تلاوت تو ضرور کرتے ہیں البتہ قرآن مجید کا ان کے دلوں میں اترنا ابھی باقی ہے۔ وہ کہتے تو کلمۂ حق ہیں لیکن اس سے ان کی مراد باطل ہوتی ہے۔ پھر اس خیال کی بھی پرزور وکالت کی گئی کہ مسلمان بنے رہنے کے لیے لازم ہے کہ اہل ایمان بھیڑ کا حصہ بنے رہیں کہ یہی سبیل المؤمنین ہے۔ دین کی تعبیر کو نظامِ وقت کے شکنجے میں کسنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظامِ وقت کی اصلاح کے بغیر ان تمام اجنبی خیالات اور التباسات فکری سے نجات کے امکانات معدوم ہوگئے جو قتل عثمانؓ سے پیدا ہونے والے شورش زدہ ماحول میں آنے والی صدیوں میں ہمارے ہاں درآتے رہے تھے۔

ایک نئی ابتداء کے لیے اس اجمالی تاریخی بیان کی ضرورت ہم نے اس لیے محسوس کی کہ ہمارا روایتی ذہن جس نے ہمیں مزاحمت کا خوگر بنا رکھا ہے اور جس میں یہ کس بل نہیں کہ وہ اقدامی عمل کا ڈول ڈال سکے، اس کے تانے بانے دوسری صدی کے شورش زدہ ماحول میں پائے جاتے ہیں۔ آیئے! اس بات کی قدرے تفصیل سے وضاحت کی جائے۔

مسلم تصورحیات پر اجنبی سائے

کبھی آپ نے سوچا کہ علوم شرعی جسے روایتی ذہن رأس العلم قرار دیتا ہے خالصتاً قرآنی ثقافت کا پروردہ ہے یا اس کی تعبیر وتشکیل پر اجنبی ثقافت کے سائے مسلسل پڑتے رہے ہیں؟ یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ علوم شرعی کی دانش گاہیں اگر واقعی رأس العلم کی حامل ہیں تو ان دانش گاہوں سے امت کے دفاع کے لیے کسی برتر ٹیکنالوجی کا کوئی نسخہ برآمد کیوں نہیں ہوتا؟ رہے وہ علوم جو فضاؤں پر کمنڈ ڈالتے اور بحر وبر کی پوشیدہ قوتوں کی تسخیر کرتے ہیں تو ہم انہیں غیر شرعی علوم گردانتے اور ان کے حصول کو کمتر درجے کا وظیفہ قرار دیتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ معاشرے میں ''رأس العلم'' کو چھوڑ کر کمتر درجے کے علوم میں اپنی توانائی ضائع کرنے کا رجحان پیدا ہو۔ پھر اس بات پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ یہ 'علوم شرعی' جو فقہائے کے دواوین کا ایک بحرِ بے کنار ہے، جہاں مفسرین کی لایعنی بحثوں میں مطالب قرآنی گم ہو کر رہ گئے ہیں اور جہاں متضاد روایتوں کی بحث اور راوی کے کذب

وصدق پر لامتناہی بحث کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے، کیا یہ واقعی مطلوب ومقصود بھی ہیں یا نہیں۔ عہد رسولؐ کی ثقافت میں جب فقہاء کے دواوین، رجال کی کتابیں، مفسرین کی موشگافیاں اور متصوفین کے ملفوظات کا کوئی دفتر مرتب نہیں ہوا تھا قرآن مجید کی سیدھی سادی تلاوت ہر ذہنی سطح کے اہل ایمان کو راہ یابی کی ضمانت دیتی تھی۔ اس نغمۂ خداوندی میں راہ یاب قوموں کے والہانہ تذکرے اور گمراہ قوموں کے عبرتناک انجام سے مخاطب کے دل پر صرف ہیبت ہی طاری نہیں ہوتی بلکہ کائنات کے اسرار رموز کے بیانات پڑھ کر اسے اپنی قدر و منزلت اور اپنے مفوضہ رول کا صحیح ادراک ہوتا۔ قرآن ایک ایسے دین کا داعی تھا جہاں والہانہ سپردگی پر اصرار تھا۔ یہاں رسوم عبودیت کو اصر واغلال قرار دیا گیا تھا پھر بھلا اس بات کی گنجائش کہاں تھی کہ رموزِ زندگی اور امور عبودیت کے ایک ایک رکن پر فرض، واجب، نفل، سنت، مباح اور مستحب کی بحث چل نکلے۔ قرآن نے ایک نئے ذہن کی بناڈالی تھی۔ اس نئی ابتداء میں انسانوں کو غور وفکر، تدبر و تفکر اور انفس وآفاق کی تسخیر کا کام انجام دینا تھا۔ بندوں میں یہ ممتاز گروہ جو نظام کائنات میں اپنی بصیرت کے سبب تقویٰ شعاری میں سبقت لے جانے والوں پر مشتمل تھا انہیں اہل علم یا علماء کہا گیا۔ یہ تھا وہ قرآنی دائرۂ فکر اور یہ تھا مستقبل کا وہ ذہنی انقلاب جس کا قرآن داعی تھا۔ آنے والے دنوں میں اگر یہ قرآنی دائرۂ فکر پوری طرح برقرار رہتا تو امت میں ایجادات واکتشافات کو مذہبی وظیفے کے طور پر انجام دینے کی ریت تشکیل پاتی۔ غیر قرآنی اقوام کے مقابلے میں جو نظامِ کائنات کی سرِّیت کے ادراک سے عاجز تھے، جو توہمات کے زیر اثر فطرت کی پرستش کو اپنا فریضہ منصبی خیال کرتے تھے، حاملین قرآن اس بات کے کہیں زیادہ اہل تھے کہ وہ کائنات کو، جیسی کہ وہ ہے، اس کی اصل ماہیئت کے ساتھ مطالعے کا موضوع بنائیں۔ لیکن افسوس کہ اس قرآنی دائرۂ فکر پر اجنبی افکار ونظریات کی یورش نے مسلمانوں کو اس فطری اور منطقی فریضۂ منصبی سے یکسر دور کردیا۔

فکر ونظر میں یہ غیر معمولی تبدیلی، جس نے آنے والے دنوں میں امت کی گویا سمت ہی بدل کر رکھ دی، بنیادی طور پر تصور حیات کی تبدیلی تھی۔ آنے والے دنوں میں جب اس تصور حیات کے نتائج فکری اور نظری سطح پر کہیں زیادہ منقح ہوگئے، اس کے سد باب کی کوئی کوشش اس لیے کارگر نہ ہوسکی کہ پچھلی صدیوں کو ثم الذین یلونهم کے زیر اثر تقدس کا درجہ حاصل ہوگیا تھا جس پر سوالیہ نشان لگانا مستقبل کے علماء ومفکرین کے لیے ممکن نہ رہا۔ فکر ونظر میں یہ تبدیلی کیسے درآئی؟ مسلمان تدبر و تفکر اور تعقل کی راہ سے تقلید اور اسلاف پرستی میں کیسے مبتلا ہوئے؟ یہ ایک ایسی دل گرفتہ داستان ہے جس کے تفصیلی محاکمے کے بغیر مروجہ اور منحرفہ مسلم تصورِ حیات کو دوبارہ اپنی اصل پر لوٹانا ممکن نہیں۔

یہ سب کچھ ہوا کیسے، یہ وہ کلیدی اور حساس سوال ہے جس پر سنجیدہ غور وفکر اور علمی تحلیل وتجزیہ کی ریت قائم ہونا ابھی باقی ہے۔ بارہ صدیوں کے التباساتِ فکری کی بنیادیں جن ایام میں پائی جاتی ہوں اگر انہیں مقدس قرار دے کر ان کے بارے میں

کسی صحت مند تنقیدی گفتگو کا دروازہ بند کر دیا جائے تو ہمارے لیے اپنے فکری زوال کی بنیادوں پر تیشہ چلانا ممکن نہ ہوگا۔ بھلا اس خیال سے کون انکار کرسکتا ہے کہ قتلِ عثمانؓ اور خلافت راشدہ کے سقوط کے بعد ریاست کے مرکزی دھانچے میں جو کمزوری آ گئی تھی اور جس کے سبب مختلف خانہ جنگیوں اور بغاوتوں کا سلسلہ جاری تھا اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے والوں میں جا بجا ایسے عالم نما، قصاص راویوں اور حفاظ کا ظہور ہو رہا تھا جو ہر قسم کے رطب و یابس کو عہد رسولؐ کے حوالے سے مسلمانوں میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ اسلامی ریاست میں خود اس کے اندرون سے اس فکری حملے کی سنگینی قبائلی بغاوتوں سے کہیں زیادہ تھی جس کے مداوا کے لیے عمر بن عبدالعزیز کو یہ خیال آیا کاش صحیح ترین اقوال و آثار کو کوئی مدون کر دیتا تا کہ تاریخ و آثار کے نام پر رطب و یابس کی ترویج و اشاعت کا سلسلہ رک جاتا۔ عمر بن عبدالعزیز کی مختصر مدت خلافت اس عظیم فکری پروجیکٹ کی متحمل نہ ہوسکی۔ آنے والے دنوں میں روایتوں کی تصحیح و تنقید کا کام انفرادی طور پر ہی انجام پاتا رہا۔ افراتفری کے اس ماحول میں وہ لوگ بھی سرگرم رہے جو منسوب الی الرسول اقوال کے حوالے سے امت میں افتراقِ فکری اور التباساتِ نظری کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ گویا ہم جس عہد کو سلفِ صالحین کے عہد سے موسوم کرتے ہیں وہاں سلفِ طالحین کی کثرت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ تو مسئلہ کا صرف ایک رخ ہے جس پر ہمارے ہاں خاصی بحث تمحیص ہوتی رہی ہے البتہ اصل مسئلہ جس پر میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، اور جو میرے نزدیک ہمارے تصورِ حیات میں بنیادی تبدیلی کی وجہ رہی ہے، وہ مسلم فکر کی ابتداء وارتقاء سے متعلق ہے۔

علم کو شرعی اور غیر شرعی کے خانوں میں تقسیم کرنے اور خود ساختہ اصحابِ علومِ شریعت کے پیشوائیت کے منصب پر فائز ہو جانے سے نہ صرف یہ کہ اسلام کی ایک مرسوم تعبیر سامنے آئی بلکہ آنے والے دنوں میں علم کے سلسلے میں مسلمانوں کا تصور یکسر تبدیل ہوتا گیا۔ مفروضہ علم شرعی جس کی اساس وحی ربانی میں بتائی جاتی تھی اور جسے اہل ایمان کی فلاح و نجات کے لیے لازم قرار دیا گیا تھا اب چونکہ رأس العلم قرار پایا اس لیے غیر شرعی علوم کے سلسلے میں اہل ایمان کے دلوں میں تحقیر و بے اعتنائی پیدا ہوئی۔ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے کیسے ہو گیا اس کی بہتر تفہیم کے لیے لازم ہے کہ ہماری نگاہیں اس عہد کے سماجی منظرنامے کو کسی حد تک مستحضر کرسکیں جہاں فکر و نظر کی یہ تبدیلی وقوع پذیر تھی۔ تاریخ اور روایت کی کتابوں میں اس نامحسوس عمل کی تفہیم کے لیے خاصا مواد موجود ہے۔

اسلام کی حیثیت گو کہ ایک آفاقی دین کی ہے جسے تاریخ کے آخری پیغمبرؐ کے ہاتھوں آخری ساعت تک کے لیے نازل کیا گیا ہے البتہ اس کی ابتداء ایک بدوی معاشرے سے ہوئی تھی۔ پہلی نسل کے مسلمان اس حقیقت سے آشنا تھے کہ قبائلی نظام اور مروجہ سیاسی و سماجی ادارے ایک آفاقی دین کی تنصیب کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ لہذا پہلی نسل کے مسلمانوں نے نئے نظامِ انصاف کے قیام کے لیے نئے سماجی اور سیاسی ڈھانچوں کی تشکیل کی کوشش کی۔ انہیں جو چیز قرین انصاف دکھائی دی اسے انہوں نے بلاتکلف

اختیار کیا۔ حتیٰ کہ اس عمل میں انہیں اپنے بعض سابقہ اقدام کی نفی کرنا پڑی تو وہ اس سے بھی نہ ہچکچائے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں عہد رسولؐ کے بعض فیصلوں میں ترمیم و تنسیخ یا خود اپنے ہی بعض سابقہ فیصلوں کے بارے میں یہ کہنا کہ تب ہم ایسا کرتے تھے اور اب ہم ایسا کرنا زیادہ قرینِ انصاف سمجھتے ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ پہلی نسل کے مسلمان کسی عہد کو محض عہد رسول سے قربت کی وجہ سے تقدس کا حامل نہیں سمجھتے تھے۔ ایک خلیفہ کے لیے ممکن تھا کہ وہ اپنے پیش رو سے بدلی ہوئی صورتِ حال میں، بلا تکلف اختلاف کرے اور اپنے نئے اقدام کو موجودہ نئی صورتِ حال میں انصاف سے کہیں زیادہ قریب بتائے۔ حضرت عمرؓ نے جب تالیف قلب کے سلسلے میں نص کی موجودگی کے باوجود اپنے پیش رو قائدین سے الگ راہ اختیار کی یا جب آپ نے قطع ید کی قرآنی حد کو مخصوص حالات کے تحت معطل کرنا مناسب سمجھا یا جب مفتوحہ آراضی کے سلسلے میں آپ نے رسول اللہ کی قائم کردہ نظیر سے مختلف موقف اختیار کیا تو وہ اس ایقان کے حامل تھے کہ تقدیس کسی عہد یا کسی فیصلے کو نہیں بلکہ اس غایت انصاف کو ہے جس کے قیام کے لیے خدا نے محمدؐ رسول اللہ پر اپنی کتاب نازل کی۔ اخذ و اکتساب کی اس صحت مند روایت نے جزیرۃ العرب کے اس مختصر سے گروہ کو جسے قیادت و سیادت کا کوئی تجربہ نہ تھا، دنیا کے ایک بڑے خطے کے انتظامات کا اہل بنا دیا۔ رومی اور ایرانی حکومتوں کے پاس انتظام و انصرام کا جو تجربہ تھا ان سے اخذ و استفادے میں کسی تکلف کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ کسی چیز کو یہ کہہ کر رد کرنا کہ اس کی بنیادیں اجنبی تہذیب میں پائی جاتی ہیں ابتدائی مسلمانوں کا شعار نہ تھا۔ حکمت مومن کی متاع گم شدہ سمجھی جاتی۔ سو وہ جہاں بھی مل جائے اس سے اخذ و اکتساب کو مسلمان اپنا حق سمجھتے۔ ذرا غور کیجیے عہد رسولؐ کی وہ جنگ جس کے نتائج پر بڑی حد تک امت مسلمہ کا مستقبل منحصر تھا وہاں خندق کا کھودا جانا خالصتاً فارسی تجربے کی پیداوار تھا۔ لیکن اس مشورے کو اختیار کرنے میں آپؐ نے کسی ذہنی تحفظ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انتظامی تجربوں اور مروجہ ٹیکنالوجی کے حصول کی حد تک تو یہ اخذ و استفادے صحت مند رویے کا اظہار تھے جس کی بھرپور حوصلہ افزائی کی گئی۔ البتہ اخذ و استفادے کی اس سماجی فضا میں جہاں عیسائی اور یہودی علماء بھی داخل اسلام ہو رہے تھے اور جو اپنے ساتھ علمی مطالعات کا سابقہ منہج بھی لے آئے تھے ان کے تعامل کا اثر بھی فطری تھا۔ دیکھا جائے تو بات یہیں سے خراب ہوئی۔

پہلی صدی ہجری کے خاتمے تک ایسے لوگوں کی وافر تعداد ریاست کے مختلف علاقوں میں منظر عام پر آچکی تھی جو عہد رسولؐ کے بیانات اور ان ایام کے ایمان افروز تذکروں سے عوام الناس میں قصاص، راوی اور واعظ کی حیثیت سے متعارف ہو رہے تھے۔ جوں جوں عہد رسولؐ زمانی طور پر دور ہوتا جاتا تھا آثار و ایام کے ان بیانات کی سماجی، جذباتی اور علمی حیثیت بڑھتی جاتی تھی۔ پھر ان بیانات کی محض واعظانہ حیثیت نہ تھی بلکہ ان کی روشنی میں اجتماعی اور انفرادی مسائل کے حل کی کوشش کی جاتی۔ دوسری صدی ہجری کے نصف اول تک آثار و نظائر سے باضابطہ مسائل کے استخراج کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے ان

واعظین کی باضابطہ مجلسیں قائم ہوگئیں اور ایسا فطری بھی تھا کہ مسلمان ذات ختمی رسالت سے جذباتی وابستگی کے سبب ایام و آثار کے ہر بیان میں حظِ ایمان کا سامان پاتے۔ عہد رسول کے ان تاریخی بیانات کی تحفیظ کے ساتھ ہی اس داعیہ کا پیدا ہونا بھی فطری تھا کہ ان بیانات سے ہم اپنی زندگیوں کو کس طرح تابدار بنائیں۔ ابتداء میں آثار وروایات کا علم، قصوں اور شانِ نزول کے ذریعے قرآنی تاویلات کے مناہج اور ان آثار سے مسائل کے استخراج کی کوشش یہ سب کچھ ایک ملا جلا عمل تھا کہ اس وقت تک فقہاء مفسرین اور محدثین کی الگ الگ شناخت قائم نہیں ہوئی تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ مذہب کے حوالے سے اہل علم کے ایک طبقے نے عام مسلمانوں سے الگ اپنی شناخت واضح کر لی تھی۔ البتہ دوسری صدی کے خاتمے تک محمد بن ادریس شافعی کی پہلی باضابطہ مدونہ علمی کوششوں کے سبب حاملینِ علوم دین کی واضح شکل وصورت سامنے آگئی۔ شہاب زہری جو پہلی صدی کے خاتمے پر روایتوں کے سب سے بڑے جامع کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں ان کا تذکرہ بھی تاریخ کی کتابوں میں محض آثار رسولؐ کے عالم کی حیثیت سے ملتا ہے۔ عہد رسول کے سیدھے سادے ایمان افروز تذکرے کو باقاعدہ علم شرعی اور رأس العلم بننے میں مزید کوئی سو سال کا عرصہ لگا۔ الرسالہ کی تنصیف گویا اس بات کا اعلان تھی کہ اب مسلمانوں میں بھی ایک طبقۂ احبار یا مذہبی پیشوائیت متشخ ہو چکی ہے۔ یہ نئی پیشوائیت جسے دوسری صدی کے خاتمے تک ایک واضح شکل مل چکی تھی احبارِ اسلام کی شکل اختیار نہ کرتی اگر اس نے علوم کو شرعی اور غیر شرعی کے خانوں میں تقسیم نہ کیا ہوتا۔ آثار وایام کے علماء تو پہلے بھی موجود تھے جن کی معلومات سے پہلی نسل کے مسلمان بھی استفادہ کرنا مناسب خیال کرتے تھے۔ خلفائے راشدین کی مشاورتوں میں اس عمل کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔ بعد کے عہد میں معاملات قضاء میں ان سے استفادے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ البتہ یہ خیال کہ یہ حضرات حاملین علوم نبوت ہیں، ان کا علم علمِ شرعی ہے اور یہ وارثین انبیاء ہیں، یہ وہ خیالات ہیں جن کی بازگشت کم از کم ابتدائی دو صدیوں کے دوران سنائی نہیں دیتی۔ مسلمانوں میں جب یونانی علوم کے زیر اثر کلامی بحثوں کا سلسلہ چل نکلا اور جب اس صورتِ حال نے ایک دانشورانہ انارکی کی کیفیت پیدا کر دی تب پہلی بار یہ سوال ہمارے لیے اہمیت اختیار کر گیا کہ کون سے علوم واقعتاً مفید ہیں اور کن علوم کو لائق استرداد سمجھنا چاہیے۔ شرعی اور غیر شرعی علوم کی تقسیم نے اگر ایک طرف معقولات کے سیلاب کو روکنے میں مدد دی تو دوسری طرف آگے چل کر اس سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ بہت سے مفید علوم، علوم شرعی کی تعریف سے باہر رہ گئے۔ علوم شرعی کا محدود تصور جس سے خود اب قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ باہر رہ گیا تھا اور جس کا انفس و آفاق میں غور وفکر کی دعوت دینے والی تمام آیات احاطہ نہیں کرتی تھیں مسلم ذہن کو بہت جلد ایک ایسی بند گلی میں لے گیا جہاں سے اس کا نکلنا آج بارہ صدیوں کے بعد بھی ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

دیکھا جائے تو ابتدائی صدیوں میں علوم کا ارتقاء کسی واقعی منصوبہ بندی سے خالی رہا۔ اس دانشورانہ انارکی کا ایک سبب تو یہ

تھا کہ فتنۂ قتل عثمان کے بعد مرکزی حکومت کی گرفت خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ آنے والے دنوں میں جب خلفاء کی جگہ موروثی ملوکیت نے لے لی، ریاست کی پہلی ترجیح اسلام کے بجائے اپنے اقتدار کی بقا واستحکام بن گئی اور چونکہ اس موروثی نظام کے استحقاق کے لیے براہِ راست دلیل لانا مشکل تھا اس لیے ان اصحابِ فضیلت اور حفاظ حدیث کی بن آئی جو فتنہ کے خوف سے سلطان جائر کی اطاعت کو لازم قرار دیتے تھے۔ نظامِ وقت کی مخالفت اور موافقت میں وضعی حدیثوں کی کثرت اسی بات پر دال ہے کہ جو نظام خود ان وضعی حدیثوں کے سہارے اپنے جواز اور استحقاق پر دلیل لاتا ہو بھلا اس کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ ان اصحاب علم وفضیلت کے علمی فتنوں کا قلع قمع کرتا۔ احادیث کی کتابوں میں جہاں اموی حکمرانوں کی سمندری فتوحات کی تقدیس میں روایتیں موجود ہیں وہیں ایسی روایتوں کی بھی کمی نہیں جو بعض عباسی خلفاء کو نام بنام سند جواز فراہم کرتی ہیں۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اموی خلیفہ عبدالملک کے عہد میں جب مکہ اور اس کے اطراف پر عبداللہ بن زبیر کے قبضے کی وجہ سے شامی مسلمانوں کے لیے حج کی خاطر وہاں جانا سیاسی اعتبار سے نامناسب سمجھا گیا تو یروشلم میں ایک متبادل زیارت گاہ کے لیے شہاب زہری کے حوالے سے ایک ایسی روایت سامنے لے آئی گئی جو مذہبی اعتبار سے عبدالملک کے نوتعمیر قبّہ کو حرمِ مکی کا مقابل قرار دیتی تھی۔ گویا حفاظ حدیث کے سماجی وقار اور بڑھتے اثر ورسوخ سے نظام وقت مسلسل فائدہ اٹھا رہا تھا۔ دوسری طرف کچھ تو اس سرکاری سرپرستی کے زیر اثر اور کچھ عہد رسول کے ایام وآثار سے عام مسلمانوں کی جذباتی وابستگی کے سبب ان علوم کے حاملین کے لیے عام ذہنوں میں قدر ومنزلت کا پیدا ہونا فطری تھا۔

دوسری صدی کے وسط تک حفاظ حدیث کے سماجی اثر کا یہ عالم ہو گیا کہ ان کی مجلسوں کا وقار مقامی حکمرانوں سے بھی بڑھ گیا۔ یہ حضرات جب ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتے تو ان کے استقبال کے لیے ایک خلقت اُمڈی آتی۔ عوامی تائید واحترام کے یہ غیر معمولی مظاہر وقت کے حکمرانوں کو بھی نصیب نہ تھے۔ اصحاب فضیلت کی اس غیر معمولی پذیرائی نے ان علوم کے حصول کے لیے ایک عمومی لہر کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ تیسری صدی کی ابتداء تک اصحاب علم کے مابین علمی فتوحات کا معیار یہ ہو گیا کہ کس کے پاس کتنی روایتیں ہیں اور ان روایتوں میں بھی کس کے پاس کتنی ثلاثی ہے اور کتنی رباعی۔ یعنی تین راویوں سے آنے والی حدیثوں کی تعداد کتنی ہے اور چار راویوں والی کتنی، کہ علم کی دنیا میں قد وقامت کے تعین کا معیار اب یہی رہ گیا تھا۔ آگے چل کر جب تفسیر، فقہ اور روایتوں کے علوم الگ الگ شکل میں مرتب ہونے لگے اور جب رجال کی جرح وتعدیل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا تو ان علمی معرکوں میں یہ چیز باعثِ فخر سمجھی جانے لگی کہ کس کے پاس رطب یابس کا ذخیرہ کتنا زیادہ ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ بسم اللہ کی تشریح وتعبیر میں دفتر کے دفتر لکھ سکتا ہے تو کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ صرف بسملہ کے نقطۂ ب پر اتنا کچھ لکھ سکتا ہے کہ اسے اٹھانے کے لیے سات اونٹوں کی ضرورت پیش آئے۔ تفسیر ہو یا تاریخ، فقہاء کے دواوین ہوں یا روایات کے مجموعے ان سبھوں

کی ترتیب وتالیف میں کیفیت کے بجائے کمیت پر کہیں زیادہ زور رہا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں متضاد روایتوں کی بھرمار اور تفسیری حواشی میں بے سروپا داستانوں کی موجودگی اسی بات پر دال ہے کہ اس عہد میں علمی جاہ وحشم کا تعین اس بات سے ہوتا تھا کہ کس نے کتنی مجلدات تصنیف کر ڈالی ہیں۔ طبری جو ہمارا پہلا باقاعدہ مورخ ہے، اور جس کی داستان پسندی نے مسلمان ذہن پر گہرے اثرات ڈالے ہیں، اس کی تیس جلدوں پر مشتمل تفسیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس تفسیر کا خلاصہ ہے جو بالاصل تین سو جلدوں میں لکھی گئی تھی۔ اسی طرح صحیح بخاری جس میں کوئی چار ہزار روایتوں کا اندارج ہے، کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چھ لاکھ روایتوں کے نقد وتجزیے کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ اسی طرح ابوذرعہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں سات لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ ایک ایسے عہد میں جہاں علمی وجاہت کا پیمانہ معیار کے بجائے مقدار بن گیا ہو اس طرح کے دعاوی ناقابل فہم نہیں۔ آج ہماری دسترس میں نہ تو طبری کے تین سو تفسیری مجلدات ہیں اور نہ ہی ابوذرعہ کی سات لاکھ حدیثیں، اس لیے ہمارے لیے ان اقوال کی واقعی تصدیق کرنا مشکل ہے۔ البتہ یہ خیال کہ اہل علم کے مابین مجلدات کی ضخامت اور کثرت پر فخر ایک مستحکم روایت بن گئی تھی، اس بات کے ثبوت کے لیے ہمارے ثقافتی ورثے پر ایک نظر ڈالنا کافی ہے۔ سیوطی جو نویں صدی کے مصنف ہیں اور جن کی تصنیف 'الاتقان' کو اپنی تمام تر التباسات فکری کے باوجود علوم القرآن پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت حاصل ہے وہ بھی اس بات کا دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں کہ اس موضوع پر پائی جانے والی تمام تر معلومات کا عرق اس کتاب میں کشید کر لیا گیا ہے۔ قدماء کی کتابوں کو نئی تالیفات میں ہضم کر لینے یا اس کے عرق کو پوری طرح کشید کر لینے کا رجحان جب ذرا تھما تو قدیم تصنیفات پر حاشیہ در حاشیہ لکھنے اور ان کی مشکل اور ثقیل تلخیصات کی طرف توجہ ہوئی۔ گویا قدماء نے جو معلومات جمع کی تھیں اسے ان علوم کا منتہا ومقصود سمجھ لیا گیا۔ ان کے تحلیل وتجزیے اور تنقیدی مطالعے کی کوئی صحت مند روایت قائم نہ ہو سکی۔ رہا وحی ربانی کا راست مطالعہ تو اس بارے میں یہ خیال عام ہوا کہ قدماء غور وفکر کا سارا کام انجام دے چکے اور یہ کہ اب ذہن اس لائق نہیں رہے جو ان بظاہر مرعوب کن مجلدات پر اضافہ کر سکیں۔

مسلمانوں میں علوم کے ارتقاء کا یہ سلسلہ، جو عہد فتنہ کے زیر اثر دانشورانہ انارکی سے شروع ہوا اور جو عہد بعہد مختلف علوم اسلامیہ کی شکلوں میں منقح ہو کر ہم تک پہنچا ہے، کے بارے میں درج ذیل باتیں وثوق سے کہی جا سکتی ہیں:

۱- موجودہ علوم اسلامیہ جنہیں ہم آج تفسیر وتاویل، جرح وتعدیل، روایت ودرایت، اصول الفقہ، منطق وفلسفہ اور عروض وبلاغت سے موسوم کرتے ہیں یہ علوم اپنی موجودہ شکلوں میں عہد رسول میں نہیں پائے جاتے تھے۔

۲- قتل عثمانؓ سے پیدا ہونے والے سیاسی بحران نے جہاں قصاص اور واعظین کے لیے اس بات کے امکانات پیدا کر دیے کہ وہ اپنے دلچسپ بیانات اور رنگ آمیز وقائع نگاری کے ذریعہ تعبیری پراگندگی پیدا کریں وہیں نظامِ وقت پر موروثی

ملوکیت کے قبضے نے خالص قرآنی دائرہ فکر میں کسی واقعی علمی تحریک کے امکانات کو بڑی حد تک ختم کر دیا تھا۔ افراتفری کے اس ماحول میں جو لوگ ایام وآثار کے حوالے سے سماجی منظرنامے پر طلوع ہو رہے تھے اور جن میں صادقین وصالحین کے ساتھ ساتھ وضاعین وکذابین کی بھی خاصی بڑی تعداد شامل ہو گئی تھی، ان کے سماجی دبدبہ اور مذہبی اثرات پر روک لگانا یا اسے قابو میں رکھنا ممکن نہ رہا۔

۳- قرّاء کے مقابلے میں حفاظ حدیث کی بڑھتی سماجی مقبولیت اور اس فن کا رأس العلم کی حیثیت سے متعارف اور مشہور ہو جانا، حتیٰ کہ آنے والے دنوں میں اس کے بطن سے نکلنے والے علوم کو علوم شرعی قرار دینا محض ایک اتفاقی اور حادثاتی امر تھا۔

۴- روایتوں کو فقہی ابواب کے تحت مرتب کرنا جیسا کہ امام بخاری نے کیا، یا آثار وایام کی روشنی میں احکام برآمد کرنے کی کوشش، جس کا ایک اظہار مؤطا امام مالک ہے، یا کتاب وسنت کی روشنی میں دانش انسانی کے استعمال سے ممکنہ مسائل پر اجتماعی غور وفکر کا سلسلہ، جس کی طرح ابوحنیفہ نے ڈالی، یا کتاب وسنت کی روشنی میں احکام وضع کرنے کے علمی اصول جسے شافعی نے وقیع انداز سے مرتب کرنے کی کوشش کی، یہ سب کی سب بنیادی طور پر ان جلیل القدر علماء کی انفرادی کاوشیں تھیں۔ ایسا کرنے کے لئے نہ تو وہ منجانب اللہ مامور تھے اور نہ ہی ان انفرادی کوششوں کو دین اسلام کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔ جن محدثین اور فقہائے عظام کی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں اپنے عہد میں صرف یہی حضرات ان علمی سرگرمیوں میں مصروف نہ تھے۔ روایتوں کے نہ جانے کتنے مجموعے اور فقہا کے نہ جانے کتنے دبستان تاریخ کے صفحات میں گم ہو گئے۔ لیکن ان کے غیاب سے ہم دین اسلام میں کسی تشنگی کا احساس نہیں پاتے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسی عہد کی وہ کتابیں جو ہم تک پہنچی ہیں ہمارے لئے فہمِ دین کا ناگزیر حوالہ قرار پائیں۔ اہل علم کے ان انفرادی پروجیکٹ کو اپنی تمام تر جلالت علمی کے باوجود، ان حضرات کی مستحسن انفرادی کاوشوں کی حیثیت سے دیکھا جانا چاہئے اور بس۔

۵- ائمہ اربعہ کا canonization، جسے شاہ ولی اللہ جیسے حضرات بھی من جانب اللہ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں، محض ایک اتفاقی اور حادثاتی امر ہے۔ ملک الظاہر شاہ بے برس نے اگر مذہبی خانہ جنگیوں سے تنگ آ کر بیک وقت ان چار مسالک کو سرکاری طور پر تسلیم نہ کیا ہوتا تو آگے چل کر نہ تو حرم مکی میں چار علیحدہ مصلّوں کا قیام عمل میں آتا اور نہ ہی سنی مسلم فکر ائمہ اربعہ کو تقدیس کا حامل سمجھتی۔ جس طرح سفیان ثوری اور امام اوزاعی جیسے جلیل القدر فقہاء اپنی زبردست سماجی مقبولیت کے باوجود اپنے عہد میں رشد وہدایت کا کام انجام دینے کے بعد تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو گئے اسی طرح حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی دبستان بھی تاریخ کی زینت بن جاتے۔ لیکن شاہ بے برس کے ایک قدم نے، جو دراصل رفع فتنہ کی خاطر اٹھایا گیا تھا، جو ایک شخص کا انفرادی فیصلہ تھا اور جس کی حیثیت محض ایک اتفاقی اور حادثاتی امر کی ہے، آنے

والے دنوں میں ائمہ اربعہ کے تصور کو مسلم فکر میں کچھ اس طرح راسخ کر دیا کہ اب عام انسانوں کے لئے ان کے بغیر دینی زندگی کا تصور محال نظر آتا ہے۔

٦- علوم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم اصحاب فن کا انفرادی فیصلہ تھا جس کے لئے وحی ربّانی سے کوئی دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ علوم جو شرعی قرار دئے گئے قرآن مجید کی روشنی میں ان کا شرعی ہونا بھی محل نظر ہے۔ کسی مخصوص عہد کے اصحاب فن کے التباس فکری کو مستقبل کی تمام نسلوں کے لئے سدّ راہ اور حجت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

٧- شرعی علوم کے اس محدود تصور نے مسلمانوں میں سماجی، سائنسی اور اکتشافی علوم کا راستہ روکنے میں بنیادی رول ادا کیا۔ حتیٰ کہ جو لوگ عباسی بغداد میں تحقیقی اور اکتشافی سرگرمیوں میں مصروف رہے وہ اجنبی ثقافت کے پروردہ سمجھے گئے اور وہ خود بھی اس کسک کے ساتھ جیتے رہے کہ حاملین علوم شریعت کے مقابلے میں انہوں نے ایک کم تر درجے کا وظیفہ اختیار کر رکھا ہے۔ علوم شرعی کے حاملین چونکہ خود کو وارثین نبوت بتاتے، انہیں فکر اسلامی کا معتبر شارح اور ترجمان سمجھا جاتا، اس لئے کسی کو اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس مفروضے کو وحی اور عقل کی روشنی میں چیلینج کرتا۔

٨- قرآن مجید کو فقہی، شرعی یا مولویانہ انداز سے پڑھنے والوں نے کوئی پانچ سو آیات کو آیاتِ احکام کی حیثیت سے اپنے غور و فکر کا مستحق سمجھا تھا۔ اس طرف لوگوں کی توجہ کم ہی گئی کہ یہ علوم جو بنیادی طور پر ان پانچ سو آیات کو اپنی توجہ کا مستحق سمجھتے تھے، اس نے وحی ربانی کے ایک بہت بڑے حصے کو عملی طور پر علوم شرعی کے دائرے سے باہر کر رکھا تھا۔ آیات اللہ فی الکون کے مطالعے اور مشاہدے کا علوم شرعی کے دائرے سے باہر ہو جانا ایک بحرانی عہد کی اجتہادی اور تعبیری لغزش تھی۔ جس نے آنے والی صدیوں میں امت کو تحقیق و اکتشاف کے عمل سے دور کر دیا۔ آیت احکام کے علاوہ قرآن مجید کے ایک بڑے حصے کو عملی طور پر منجمد کئے جانے کے نتیجے میں آج ہم من حیث الامۃ منصب سیادت سے معزول ہو گئے ہیں۔

یہ وہ چند بنیادی حقائق ہیں جن کی بنیادیں تو ایک مخصوص عہد کے انفرادی التباسات میں پائی جاتی ہیں لیکن ایک زمانے کی مہر ثبت ہو جانے کی وجہ سے گزرتے وقتوں کے ساتھ اسے امت کا اجتماعی فیصلہ اور راسخ العقیدہ فکر کا اظہار سمجھا جانے لگا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان انفرادی لغزشوں کے سبب، جو کبھی بعض اہل علم سے صادر ہوئیں اور کبھی سیاسی عوامل اس کی پشت پر رہے، بالکل ابتدائی ایام میں ایسے اسباب و عوامل پیدا ہو گئے کہ قرآنی دائرۂ فکر میں ایک واقعی علمی اور اکتشافی تحریک کا خاکہ دھندلا ہو کر رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وحی ربانی کی روشنی میں الٰہیات، عمرانی اور اکتشافی علوم کا ارتقاء اس انداز سے نہ ہو سکا جس کا قرآن داعی تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں رجوع الی القرآن کی تحریکیں قرآنی دائرۂ فکر کو از سر نو مہمیز کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ لیکن عملاً ہوا یہ ہے کہ راسخ العقیدگی کے دباؤ، جس کی پشت پناہی بوجوہ نظامِ وقت کرنے پر مجبور تھا، کی وجہ سے نئے مفکرین کو پرانی

فکر کا توسیعہ بننے پر مجبور ہونا پڑا۔ زوال کی صدیوں میں جہاں اجتہاد جیسے صحت مند رویے سے بھی لوگ خوف کھاتے تھے ایسا سمجھا جاتا تھا کہ کسی نئی بحث کا دروازہ کھولنا، یا امت کے قدیم فکری ڈھانچے پر ضرب لگانا، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے منافی ہوگا۔ ماضی کے مقابلے میں آج عام انسانوں کے لئے قرآن مجید کا آزاد فضا میں پڑھنا کہیں زیادہ ممکن ہے۔ آج جب شیخ الاسلام کا سرکاری اسلام عام انسانوں کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ وحی ربانی کے صفحات میں صرف سرکاری تعبیرات کو پڑھیں، ہمارے لئے ماضی کے مقابلے میں رجوع الی القرآن کا عمل نسبتاً کہیں آسان ہے۔ کل تک شیخ الاسلام کے لئے ممکن تھا کہ وہ عثمانی خلافت میں اکتشافی علوم کے لئے قائم کی جانے والی درس گاہ دارالفنون کو صرف اس لئے بند کروادے کہ اکتشافی علوم، اس کے خیال میں، شرعی علوم سے باہر کی چیز تھی۔ لیکن آج مسلم فکر کے التباسات کی پشت پر وہ سیاسی قوت معدوم ہو چکی ہے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں راسخ العقیدگی کا بے لاگ محاکمہ کرنے میں بوجوہ مزاحم ہوتی رہی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان انفرادی التباسات فکری، جس کے سبب مسلمانوں میں علوم کا ارتقاء یک رخا اور کار بے بنیاد بن کر رہ گیا ہے، ان کا نہ صرف یہ کہ بے لاگ محاکمہ کیا جائے بلکہ بالکل نئے خطوط پر ازسرِ نو قرآنی تصورحیات کے مطابق ایک نئی علمی تحریک کی داغ بیل ڈالی جائے۔ قرآن مجید جہاں بندے سے خدا کا رشتہ استوار کرتا ہے وہیں وہ بندوں کو تدبر و تفکر اور مشاہدۂ کائنات کی دعوت بھی دیتا ہے۔ فرد کا کائنات اور اس کے خالق سے یہ رشتہ ایک حساس اور نازک توازن کا داعی ہے۔ لازم ہے کہ ہم پوری کتاب کو اپنی ہدایت کا مرکز و محور بنائیں۔ اس کے برعکس محض چند آیات کو آیاتِ احکام قرار دینا یا اسے شرعی امور کا حامل بتانا افتؤ منون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض کی صورت حال پر منتج ہوگا جس کے تباہ کن نتائج کا ہم ماضی میں مشاہدہ کر چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر قرآن مجید کو ازسرِ نو راست مطالعے کا موضوع بنایا جا سکا اور ہمارے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ ہم پچھلی بارہ صدیوں کے التباسات فکری پر خطِ تنسیخ پھیر سکیں تو قرآنی دائرۂ فکر میں ایک تازہ بہ تازہ علمی تحریک ہمیں دوبارہ منصب سیادت پر فائز کر سکتی ہے۔ یہ وہ فکری دھماکہ ہے جس کے لئے امت کے بہترین دماغ کوئی بارہ صدیوں سے منتظر ہیں۔